عظمت غالب[1]

محمد عبداللہ قریشی

''عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہے تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کرکے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے''۔ اقبال۔[2]

یہ الفاظ اقبال نے اپنے ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ کے خط میں حضرت اکبر الہ آبادی کو لکھے تھے اور ان کے رنگ میں شعر بھی کہے تھے جو ''اکبری اقبال'' کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن صرف اکبر ہی پر کیا موقوف ہے، اقبال نے اپنے عہد کے ہر باکمال شاعر ــ داغ، حالی، شبلی ــ اور ان تمام عظیم پیش روؤں کی بڑائی کا بھی اعتراف کیا ہے جن سے نومشقی کے زمانے میں اثر قبول کرکے انھوں نے اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالا اور اس منزل کو جا لیا، جہاں ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہی اقبال کی بڑائی کی دلیل ہے۔ بڑا آدمی کبھی ناشکرا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے محسنوں کا احسان مانتا اور دل کھول کر اس کا اقرار کرتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور جرمنی کے کئی شاعر ان کے ممدوح نظر آتے ہیں جن پر اقبال نے نہایت عقیدت سے پیاری پیاری نظمیں کہی ہیں۔

ان سب میں رومی کے بعد ''غالب کی عظمت'' کا اعتراف اقبال نے جس جس رنگ میں کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ اردو زبان کے سب سے تیکھے شاعر اور ''حسن و عشق کی ہو بہو تصویر کھینچنے والے'' مسلم الثبوت استاد نواب میرزا داغ دہلوی سے تلمذ کے باوجود ذہنی اور

---

1 - عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوند زمیں (اقبال)۔

2- ''اقبال نامہ'' حصہ دوم، ص ۳۰-۳۱۔

معنوی لحاظ سے غالب ھی کے شاگرد تھے اور ان کی شاعری ایک طرح سے غالب کی شاعری کا تتمہ تھی۔ اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت تو اس ایک مصرع ھی سے مل جاتا ھے جس سے اقبال نے داغ کے مرثیہ کا آغاز کیا ھے، یعنی

''عظمت غالب ھے اک مدت سے پیوند زمیں''

اقبال علیہ الرحمۃ غالب کے اتنے مداح کیوں تھے؟ اس کے کئی اسباب و وجوہ ھیں۔ وہ غالب کی طرح جدت پسند، انوکھے پن کے حامی، اپنے اسلوب کے موجد اور اپنی زبان کے خالق تھے۔ غالب ھی کی طرح فلسفیانہ طبیعت پائی تھی۔ مشرق و مغرب کے فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعہ نے ان کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا کر دی تھی۔ ان کی فطرت اور شخصیت غالب سے ملتی جلتی تھی۔ لب و لہجے میں تندی و تیزی، نقطۂ نظر میں شدت، غم میں نشاط کا پیوند، پرخروش اور با رعب آواز اور حقائق پسندی— یہ سب باتیں دونوں کو ایک ھی سلسلے کا شاعر قرار دیتی ھیں۔ فرق صرف اتنا ھے کہ غالب کی آواز انفرادی اور شخصی ھے، لیکن اقبال اجتماعی احساسات کے ترجمان ھیں۔ وہ اپنے فلسفۂ خودی کے ذریعے قوم کو ایک پیغام دینا چاھتے ھیں، شاعری کو محض اظہار خیال کا بہانہ بناتے ھیں، اس لیے فلسفہ اکثر ان کے یہاں فن پر غالب آ جاتا ھے:

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ھوں محرم راز درون مے خانہ

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال
فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

لیکن غالب فلسفی سے زیادہ شاعر رھنا پسند کرتے ھیں۔ اس لیے ان کے بیان میں خالص رندانہ اور شاعرانہ رنگ زیادہ نمایاں ھے:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغز گوئے خوش گفتار
ھیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ھیں کہ غالب کا ھے انداز بیاں اور

بہر حال دونوں نے ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات کو رواج دے کر ھماری شاعری کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔

اقبال نے غالب کے دیے سے دیا بھی جلایا ھے اور اس کی بعض غزلوں پر

غزلیں بھی کہی ہیں، مثلاً ''زبور عجم'' میں اقبال کی وہ غزل جس کا مطلع حسب ذیل ہے:

مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم

غالب کی اس غزل کا جواب ہے جس کا مطلع یہ ہے:

سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہم
رنگ شو اے خون گرم تا بہ پریدن دہم

اسی طرح چند اور غزلیات میں بھی غالب کے کلام اور انداز بیان سے گہری دل بستگی، شیفتگی اور عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر چند مطلعے ملاحظہ ہوں:

موج را ازسینۂ دریا گسستن می تواں بحرے پایاں بجوئ خویش بستن می تواں
(''پیام مشرق'')

ناز بہ سرمہ تاب دہ چشم کرشمہ زانی را
ذوق جنوں دو چند کن شوق غزل سرانی را
(''پیام مشرق'')

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل و کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
(''پیام مشرق'')

بعض اشعار میں ہم آہنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے، مثلاً عشق کی شعلہ فشانی کے متعلق غالب کہتے ہیں:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اقبال فرماتے ہیں:

این حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با این ہمہ بے تابی

غالب نے بے کسی کی درد ناک تصویر کھینچتے ہوئے کہا ہے:

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

اقبال فرماتے ہیں:

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

غالب رمزیت اور ایمائیت کو واقعہ نگاری پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں :

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد محرم آنست کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

اقبال اسی نکتے کو اس طرح ادا کرتے ہیں :

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست

اقبال کے خیال میں بعض محسوسات اور جذبات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ الفاظ سے ظاہر نہیں کیے جا سکتے، صرف دل ہی ان کی ترجمانی کر سکتا ہے :

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریا ئی

غالب اس خیال کو یوں ظاہر کرتا ہے :

سخن ماز لطافت نہ پذیرد تحریر نشود گرد نمایاں زرم توسن ما

غالب کا ایک شعر ہے :

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اقبال اس میں یوں جدت پیدا کرتے ہیں :

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

اقبال کے نزدیک یہ کائنات اور اس کے تمام مظاہر روز ازل سے ارتقاء پذیر ہیں :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

غالب کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے :

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اقبال کے خیال میں بزم کائنات کی تمام ہنگامہ خیزیاں صرف عشق کے دم سے ہیں ورنہ اس میں کوئی رونق نہ ہوتی :

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ این بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

غالب اسی خیال کو یوں بیان کرتے ہیں :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کے اس شعر کی موجودگی میں :

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہیں

اقبال کا یہ شعر بھی دیکھیے جو اپنے خالق سے بصد شوخی کہا گیا ہے :

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

''غالب نے ذات باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شعلۂ ایماں کی آتش افروزی تیرے بغیر ممکن نہیں ، لیکن اس کا یہ مطلب بھی تو نہیں کہ انسان کی اہمیت کسی طرح کم ہو جاتی ہے ۔ زندگی کی رونق تو انسان ہی کی ذات سے وابستہ ہے ، اس لیے کہ تمدن کا خالق وہی ہے :

آتش افروزی یک شعلۂ ایماں تجھ سے چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے
(''نسخۂ حمیدیہ'')

لیکن اقبال نے اس تصور کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا اور کائنات کے نظام میں انسان کی اہمیت واضح کی ۔ انسانی فضیلت کا مضمون اقبال کے کلام میں قدم قدم پر ملتا ہے لیکن اس تصور سے غالب بھی نا آشنا نہیں ۔ اس کے نزدیک انسان کا رتبہ دونوں عالم سے بلند ہے ۔ اس کی قدر و قیمت اتنی زیادہ ہے کہ نہ تو نقد دنیا اور نہ نسیۂ عقبیٰ کے بدلے اسے خریدا جا سکتا ہے ۔ صرف انسان کی ہمت عالی اس قابل ہے کہ اس کی قیمت ادا کر سکے''۔[1]
اس کا شعر ہے :

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

غالب کہتا ہے کہ فرہاد کو جان دینے کے لیے تیشے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہ سرگشتۂ خمار رسوم تھا ورنہ عام طریقے سے نہ مرتا :

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

مگر اقبال نے اس سے یہ مضمون اخذ کیا کہ اگر فرہاد نے شیریں کی خاطر تیشے سے پہاڑ میں نہر کھودنا چاہی تو کون سا تیر مارا ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ عشق میں تو وہ قوت ہے کہ تیشہ چلائے بغیر آدمی ایسے کوہساروں کو اپنے کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرے :

---

1 - ''اردو غزل'' از ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، ص ۶۴ -

تیشہ اگر بہ سنگ زد این چہ مقام گفتگو است
عشق بدوش می کشد این همہ کوهسار را

بہر حال اقبال اور غالب کے موازنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ابتداء میں اقبال ایک زمانے تک غالب کے خوشہ چین اور زیر اثر رہے اور مشق کا دور ختم ہونے کے بعد انہوں نے غالب کی عقیدت مندانہ تقلید چھوڑ کر اپنے لیے ایک نیا راستہ تلاش کر لیا، اسے خوب آراستہ کیا اور جس منزل پر غالب نے چند نا تمام نقوش چھوڑے تھے وہاں سے ابتداء کی اور چند اضافوں کے ساتھ اسے بام تکمیل پر پہنچا دیا۔

اسی پر بس نہیں، اقبال نے ستمبر ۱۹۰۱ کے ''مخزن'' میں غالب کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کا شاعرانہ خراج ادا کرتے ہوئے جو نظم کہی تھی وہ ''بانگ درا'' میں شامل ہو چکی ہے۔ ایک ایک مصرع میں غالب کے فردوس تخیل اور شوخیٔ تحریر کی وہ تعریف کی ہے کہ دوسرا کوئی شاعر نہیں کر سکتا۔ مندرجہ ذیل دو بندوں سے اقبال کی غالب شناسی اور غالب پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطف گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے

یعنی بولنے کی قوت تیرے معجزہ بھرے لب پر سو فخر و ناز کرتی ہے۔ تیری فکر کی اونچی اڑان دیکھ کر ثریا بھی حیرت میں گم ہے۔ تجھے بات کہنے کا ایسا سلیقہ عطاء ہوا ہے کہ مضموں کا محبوب اس پر قربان ہو رہا ہے۔ گویا تو نے شعروں میں نہایت اعلیٰ مضامین بیان کیے ہیں۔ دلی کی کلی شیراز کے پھول کی ہنسی اڑاتی رہی ہے۔ تو اس دلی کی خاک میں آرام کر رہا ہے جو اجڑ چکی ہے۔ اور تیرا ہم آواز [جرمن شاعر گوئٹے] ویمر کے باغ میں سو رہا ہے۔

تیرے کلام میں جو خوبی ہے اس کی برابری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فکر کمال کے درجے پر نہ پہنچ جائے اور تخیل برابر اس کا ساتھ نہ دے۔

افسوس! ہندوستان کی سر زمین کو اب کیا ہو گیا! اے باریکیوں تک پہنچنے والی نظر کو دیدار کے آداب سکھانے والے! اردو کی زلف ابھی تک کنگھی کی محتاج ہے۔ اور یہ شمع پروانے کے دل کی جلن پر لٹو ہے۔ اسے ابھی ضرورت ہے کہ پروانے اس پر جل جل کر قربان ہوں۔

اس نظم کے پانچ سال بعد ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال نے ولایت جاتے ہوئے راستے میں غالب کے مزار پر حاضر ہو کر اپنے دلی تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں پہنچا جسے دھلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب، اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس، موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا۔

''اللہ اللہ! حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ دھلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔

''شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر [غلام بھیک] نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے جس پر دھلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔

''حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر 'دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی' کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہوگئیں۔ بالخصوص اس نے جب یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوح مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔

''اگرچہ دھلی کے کھنڈر مسافر کے دامن دل کو کھینچتے ھیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ھر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ھوتا۔ شہنشاہ ھمایوں کے مقبرہ میں فاتحہ پڑھا، دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے 'ھوالموجود' کی آواز سنی اور دھلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاق اثر لے کر رخصت ھوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا''۔[1]

۱۹۳۲ میں اقبال نے ''جاوید نامہ'' شائع کیا۔ اس وقت بھی وہ غالب کو نہیں بھولے۔ اس روحانی سیر میں وہ اپنے مرشد مولانا روم کے ھمراہ فلک مشتری پر پہنچے تو وھاں ان کی ملاقات منصور حلاج، غالب اور خاتون ایران قرۃالعین طاھرہ سے ھوئی۔ انھوں نے ان تینوں کی عظمت کا اظہار اس طرح کیا:

پیش خود دیدم سہ روح پاک باز آتش اندر سینہ شان گیتی گداز
در بر شان حلہ ھائے لالہ گون چہرہ ھا رخشندہ از سوز درون
در تب و تاب زھنگام الست از شراب نغمہ ھائے خویش مست

یعنی میں نے اپنے سامنے تین پاک روحیں دیکھیں جن کے دل عشق کی آگ سے گداز تھے۔ وہ لالہ گوں حلے اوڑھے ھوئے تھے اور ان کے چہرے باطنی سوز سے چمک رھے تھے۔ یہ ان عاشقوں کی روحیں تھیں جو اپنی ھی شراب میں مست تھے۔ ان میں جو سوز و گداز نظر آتا ھے یہ سب عشق ھی کا کرشمہ ھے۔

اقبال ان کے نظارے میں کھو گئے۔ مختلف مسائل ان کے ذھن میں دوبارہ ابھر آئے، جنھوں نے مدتوں انھیں بے چین اور وقف اضطراب بنا رکھا تھا مگر عارف رومی نے بڑھ کر انھیں سہارا دیا اور غالب و حلاج و خاتون عجم کا تعارف کرانے کے بعد اقبال کو مشورہ دیا کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی الجھنیں ان ارواح بزرگ کے سامنے پیش کریں۔ زندہ رود (اقبال) نے حلاج سے سوال و جواب کرنے کے بعد غالب سے اس کے ایک شعر کا مطلب دریافت کیا:

اے ترا دادند درد جستجو معنیٔ یک شعر خود بامن بگوے
''قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختۂ چیست؟''

---

1 - اقتباس مکتوب اقبال مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ از عدن بنام مولوی محمد انشاء اللہ خاں، مطبوعہ اخبار ''وطن'' لاھور، بابت ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵، جلد ۵، شمارہ ۳۹۔

یعنی اے جویائے حقیقت ! تجھے قدرت نے درد جستجو عطاء کیا ہے ۔ تو اپنے اس ایک شعر کا مطلب مجھے سمجھا دے ۔ قمری نالہ کرتی ہے تو اسی کی آگ میں جل کر خاک ہوجاتی ہے مگر بلبل گلہائے رنگا رنگ پر مرتی ہے تو وہ قفس رنگ ہو جاتی ہے ۔ اے نالہ ! تیری تاثیر حقیقت میں کیا ہے اور میں جگر سوختہ کی نشانی کہاں تلاش کروں ؟

یہ دراصل غالب کی ایک مشکل اردو غزل کا شعر ہے جس کا مطلع یہ ہے:

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی از ادا ہے داغ دل بے درد نظرگاہ حیا ہے

اقبال نے اپنی ضرورت کی خاطر ''اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے'' میں ذرا سا تصرف کرکے اسے فارسی بنا لیا ہے ، مگر بات صرف ''قفس رنگ'' پر آکر اٹک جاتی ہے کہ گل کے عشق میں جگر سوختہ ہوجانے کے نتیجے میں رنگ آجانا کیا عشق اور کیا سوختہ جگری ہوئی ؟ یہی وجہ ہے اقبال کو اس شعر کے معنی خود غالب سے پوچھنے پڑے ۔ غالب نے اس کی تشریح اپنے خاص انداز میں یوں کی :

نالۂ کو خیزد از سوز جگر هر کجا تاثیر او دیدم دگر
قمری از تاثیر او وا سوختہ بلبل از وے رنگہا اندوختہ
اندرو مرگے بآغوش حیات یک نفس اینجا حیات آنجا ممات
آن چنان رنگے کہ ارژنگی ازوست آن چنان رنگے کہ بے رنگی ازوست
تو ندانی این مقام رنگ و بوست قسمت هردل بقدر هائے و هوست
یا برنگ آ یا بہ بے رنگی گذر تا نشانے گیری از سوز جگر

مطلب یہ ہے کہ جو نالہ سوز جگر سے پیدا ہوتا ہے اس کی تاثیر ہر جگہ مختلف ہوتی ہے ۔ قمری اس کی تاثیر سے بھسم ہوجاتی ہے مگر بلبل زندہ رہتی ہے اور پھولوں سے راز و نیاز کرتی رہتی ہے ۔ اس کی مرگ میں حیات پوشیدہ ہوتی ہے ۔ نفس ایک ہی ہے مگر کہیں پیام موت بن جاتا ہے کہیں پیام حیات ۔ کہیں وہ ایسا رنگ بن کر ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے ہزاروں رنگ پیدا ہوتے ہیں اور کہیں اس سے بے رنگی کا ظہور ہوتا ہے ۔ تو نہیں جانتا کہ اس جہاں رنگ و بو میں ہر دل کو فیض الٰہی سے بقدر شدت نالہ حصہ ملتا ہے ۔تو ان دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کر، یا عشق مجازی یا عشق حقیقی ۔ جب تیرے جگر میں سوز پیدا ہو جائے گا تو نالہ کی حقیقت سمجھ میں آجائے گی ۔

زندہ رود (اقبال) غالب سے پھر پوچھتے ہیں کہ آسمان کی اس نیلی فضا میں سینکڑوں جہاں موجود ہیں ، تو کیا ہر جہان کے لیے الگ الگ ولی

اور نبی ہیں ؟ آپ کا کیا خیال ہے ؟

صد جہاں پیدا درین نیلی فضاست هر جہان را اولیاء و انبیاست ؟

غالب اس کی وضاحت کرتا ہے :

نیک بنگر اندرین بود و نبود بے بہ بے آید جہانہا در وجود
هر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃً للعالمینے هم بود

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ آفرینش کا کاروبار بدستور چل رہا ہے ، نئے جہان برابر پیدا ہو رہے ہیں ۔ جہاں کوئی عالم موجود ہوگا وہاں ایک رحمۃ للعالمین ضرور ہوگا ۔ زندہ رود (اقبال) کہتے ہیں :

''فاش تر گو زانکہ فہمم نارساست،،

اس بات کو ذرا کھول کر بیان کرو کہ میرا فہم اسے واضح طور پر سمجھ نہیں سکا ۔

غالب جواب دیتا ہے :

''این سخن را فاش تر گفتن خطاست،،

(اس قسم کی باتیں کھول کر بیان کرنا خطرے سے خالی نہیں ۔)

اقبال کہتے ہیں :

''گفتگوئے اہل دل بے حاصل است؟،،

(کیا اہل دل کی یہ گفتگو بے حاصل ہی رہے گی؟)

غالب جواب دیتا ہے :

''نکتہ را برلب رسیدن مشکل است،،

(اس نکتے کو بیان کرنا بڑی مشکل بات ہے ۔)

اس پر اقبال کہتے ہیں :

تو سراپا آتش از سوز طلب بر سخن غالب نیائی اے عجب

(تو سوز طلب سے سراپا آتش بداماں ہے ۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اپنے مفہوم کو واضح کرنے پر قادر نہیں ۔)

غالب کہتا ہے :

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست رحمۃً للعالمینی انتہاست

(تخلیق ، تقدیر اور ہدایت سے تو ابتداء ہوتی ہے جیسے قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو پیدا کیا ، اسے ٹھیک بنایا ، ہر شے کی تقدیر معین کی، پھر اسے ہدایت کا راستہ بھی دکھایا اور رحمۃً للعالمین کی ذات پاک پر اس کی انتہاء کر دی ۔)

اقبال کہتے ہیں :

من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز آتشے داری اگر ما را بسوز

(میں حقیقت کا چہرہ اب بھی نہیں دیکھ سکا ۔ اگر تیرے سینے میں حقیقت کی آگ سلگ رہی ہے تو اس سے ہمیں جلا دے ۔)

اس پر غالب کہتا ہے :

اے چو من بنیندۂ اسرار شعر این سخن افزون تر است از تار شعر
شاعران بزم سخن آراستند این کنیان بے ید بیضاستند
آنچہ تو از من بخواہی کافری است کافری کو ماورائے شاعری است

(اے زندہ رود ! میری طرح تو بھی شعر کے اسرار سے واقف ہے مگر تیری بات شاعری کی حدود سے بالاتر ہے ۔ جن شاعروں نے بزم سخن آراستہ کی کہ اس موضوع پر کچھ کہیں وہ دراصل اس مقام کی اہمیت و نزاکت سے محض بیگانہ ہیں ۔ تو جو کچھ مجھ سے پوچھتا ہے وہ کافری کی حد میں داخل ہے ۔ میں ایسی بے ادبی نہیں کر سکتا ۔)

اس روحانی ملاقات سے غالب کی عظمت اور اقبال کی نکتہ آفرینی کا بہت حد تک اندازہ ہوجاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال کے نزدیک غالب کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہ اس کو اپنا ہمراز سمجھتے اور اپنے شکوک و شبہات اس کے سامنے پیش کرکے شاھد معنی کی نقاب کشائی کے لیے اخلاص اور یقین کے ساتھ اس کی جانب رجوع کرتے ہیں ۔

مگر ان سب سے بڑھ کر جو پیغام اقبال نے ۱۹۳۶ میں ''غالب سوسائٹی'' کے نام بھیجا وہ النادر کالمعدوم کا درجہ رکھتا ہے اور چونکہ اس کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے ، اس لیے کسی قدر تفصیل بھی چاہتا ہے ۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دلی کئی دفعہ بسی اور کئی دفعہ اجڑی ۔ اس آتھل پتھل میں کئی قابل قدر یادگاریں تباہ ہوگئیں ۔ آج کوئی ان کا کھوج نہیں لگا سکتا ۔ ہر عہد میں لوگوں نے پرانی روایات اور تاریخی یادگاریں بحال رکھنے کی سعی کی مگر انقلاب کا عمل برابر جاری رہا اور ہر بار اپنا اثر دکھا کر رہا :

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۱۷۹۷ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے ۔ عنفوان شباب میں دہلی آئے ، یہیں ۱۸۶۹ میں وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قریب اپنے خسر نواب الہی بخش خاں معروف (نواب

لہارو) کے خاندانی قبرستان کی مغربی دیوار کے پاس دفن ہوئے۔ ان کے مزار کے سرہانے میر مہدی مجروح کا قطعۂ تاریخ نصب کیا گیا جس پر کندہ تھا :

رشک عرفی و فخر طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح ہاتف نے کہا ''گنج معانی ہے تہ خاک''

۱۲۸۵ھ

لیکن غالب کو ''گنج معانی'' کہنے والا بھی تہ خاک چلا گیا۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا :

عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوند زمیں مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں

زندگی میں تو غالب کی قدر جیسی کچھ تھی ، تھی ہی ، اچھی چیزوں میں کیڑے ڈالنے والے اور اس کے کلام کو مہمل کہنے والے اس وقت بھی موجود تھے۔ غالب خود گھٹن محسوس کرتا اور جل بھن کر کہہ اٹھتا تھا :

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
یا
گویم مشکل ورنہ گویم مشکل

ایسے میں اگر اس کے چند شاگرد اور سرپرست بھی اس کا خیال نہ کرتے تو وہ بیچارہ زندہ درگور ہو جاتا۔ مگر یہ دنیا مردہ پرست ہے ، وفات کے بعد اس کے کلام کی شہرت جیسے جیسے پھیلی لوگ اس کے مزار کا رخ کرنے لگے۔ اول تو مزار ہی ایسے گمنام گوشے میں واقع تھا کہ چند واقف حال لوگوں کے سوا، دوسرا کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا ، پھر اگر پوچھ گچھ کے بعد کوئی بھولا بھٹکا وہاں پہنچ ہی جاتا تھا تو اسے غالب کی قبر اور قبرستان کی حالت ، ویرانی اور شکستگی کے سبب بہت عبرت ناک معلوم ہوتی تھی۔ بعض زائر اور یورپین سیاح تو طعنے دیتے تھے کہ ہندوستانی اتنے بڑے ملکی شاعر کی قبر کو بھی اچھی حالت میں نہیں رکھ سکتے۔ اقبال نے کس حسرت سے کہا ہے :

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

شعر و سخن کے متوالے یہ باتیں سنتے ، پیچ و تاب کھاتے اور مرقد غالب کے منظر کی درستی کے لیے پر تول کر رہ جاتے۔ ۱۹۱۲ میں پہلی بار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اس مزار کی توسیع و مرمت کے لیے آواز اٹھائی، کچھ لوگ متوجہ ہوئے ، تھوڑا بہت چندہ بھی ہوا ، مگر وہ خود سیاسی ہنگاموں میں الجھ کر رہ گئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ البتہ اتنا ہوا کہ

نواب نصر اللہ خاں صاحب ، صدر محاسب سرکار حیدرآباد دکن، نے اپنے بزرگوں کے مزارات کے ساتھ ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرتے ہوئے غالب کے مزار کی مرمت کرا دی مگر منظر جیسا تھا ویسا ہی رہا ۔

۱۹۳۵ میں ایک دفعہ پھر یہ تحریک اٹھی ۔ دہلی کے ہندو مسلمان اہل علم جناب سری رام‌صاحب، مصنف ''خمخانۂ جاوید'' (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۳۰) ، کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ''غالب سوسائٹی'' رکھا گیا - اس سوسائٹی کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ، نائب صدر پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ، خواجہ حسن نظامی دہلوی اور لالہ دیش بندھوگپتا، ڈائرکٹر اخبار ''تیج'' دہلی، منتخب ہوئے ۔ سیکریٹری میر محمد حسین صاحب ، مالک فرم زنگی قلم ، دہلی ، آغا محمد اشرف مرحوم نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد اور عشرت رحمانی تھے جو ان دنوں رسالہ ''نیرنگ'' کے ایڈیٹر تھے اور آجکل ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور میں مقیم ہیں ۔ ملا واحدی صاحب، ایڈیٹر رسالہ ''نظام المشائخ'' دہلی (حال کراچی) ، پروفیسر اکبر حیدری مرحوم وغیرہ اصحاب رکن اور حکیم حاجی عبدالحمید صاحب، مالک دواخانہ ہمدرد دہلی، خزانچی تھے ۔

مرقد غالب کے شرق میں ایک بڑا قطعۂ اراضی واقع تھا ۔ اس کو حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے معقول قیمت اپنے پاس سے دے کر خرید لیا اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا - مزار غالب کے غرب میں ایک اور قطعۂ زمین حکیم واصل خاں مرحوم ، برادر بزرگ جناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں مرحوم ، کی مرحومہ بیگم صاحبہ نے اپنے داماد مسیح الملک ثانی حکیم محمد احمد خاں صاحب کی سفارش سے عطا فرما دیا مگر یہ دونوں قطعات اراضی قیام پاکستان تک خالی گود رہے کیونکہ مزار کی جگہ کو بڑھانے اور غالب ہال بنانے کے لیے اس وقت دس ہزار روپے کی ضرورت تھی اور اس سوسائٹی کے پاس تعمیر کے لیے اتنا سرمایہ نہیں تھا ۔

۱۹۳۵ میں غالب سوسائٹی ہی نے پہلی بار غالب کے یوم وفات کو جو ۱۵ فروری تھا ''غالب ڈے'' مقرر کیا ۔ اراکین مجلس کے مشورہ سے خواجہ حسن نظامی نے مقامی ہندو مسلمانوں کو خطوط لکھے اور ہندوستان کے علمی سرپرستوں اور ہندو مسلمان والیان ریاست کو ''غالب‌ڈے'' کی امداد کے لیے تار بھیجے جن کے جواب میں ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور نے بہت حوصلہ افزاء الفاظ ارشاد فرمائے اور امداد کا وعدہ بھی کیا ۔ لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سیکریٹری مسٹر میوئل نے وعدہ کیا کہ وہ ہزایکسلنسی سے

غالب کی نسبت پیغام دینے کے لیے عرض کریں گے ۔ ھز ایکسلنسی نور زاد سفیر ایران اور ھز ایکسلنسی صلاح الدین سلجوقی سفیر افغانستان نے بھی اس تحریک سے خاص گرویدگی ظاھر کرکے ثابت کر دیا کہ غالب ایشیا کا مقبول ترین شاعر ھے ۔

۱۵ فروری ۱۹۳۶ کو پہلا ''غالب ڈے'' بڑے وسیع پیمانے پر منایا گیا ۔ جلسہ اجمیری دروازہ کے باھر عربک کالج ھال میں ھوا ۔ سر گرجا شنکر باجپائی ، سیکریٹری محکمہ تعلیم حکومت ھند ، نے جلسہ کی صدارت فرمائی ۔ جناب ذاکر صاحب ، پرنسپل عربک کالج ، نے جلسہ کے لیے مکان اور سامان عطاء کیا ۔ پنڈت امرناتھ ساحر نے جو دھلی کی شاعری کا آخری سہارا تھے اور جن کے ھاں ھمیشہ مشاعرے ھوتے رھتے تھے ، اس جلسہ کے مشاعرے کو کامیاب بنایا ۔ دھلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن نے غالب ڈے کی سرگرمیوں میں خاصا تعاون کیا اور اس کے افسران مسٹر فیلڈن ، مسٹر سیٹھنا ، مسٹر بخاری اور آغا اشرف نے غالب ڈے کی نشرو تبلیغ کا خاص اھتمام کیا ۔

مشاھیر کے پیغامات اور مسز سروجنی نیڈو کی تقریر اس جلسہ کے خاص فیچر تھے ۔ تقریر انگریزی میں ھوئی جو بڑی زور دار تھی ۔ ''جب وہ بولتی تھیں تو ایسا معلوم ھوتا تھا کہ ھوائی جہاز غراتا ھوا زمین سے آسمان کی طرف چلا یا خشک اور پیاسی زمین کو سیراب کرنے کے لیے مستانہ بادل ٹھنڈا پانی اپنے اندر بھر کر جھومتا ھوا آسمان سے زمین کی طرف اترا یا گنگا دریا پہاڑ کی بلندی سے بہتا ھوا نیچے آیا اور کنارے پر کھڑے ھوئے قدرتی پھولوں کے پودوں نے جھک جھک کر اپنے چہرے اس شفاف پانی میں دیکھنے شروع کیے ۔ جب وہ بولتی تھیں تو چاند کو اپنے طرز ادا کے بادلوں میں چھپا دیتی تھیں یعنی سننے والوں کے فہم و فراست کے چاند ان کی گویائی کے جادو سے مسرور و مسحور ھی نہیں ھوتے بلکہ سرور ابر میں چھپ جاتے تھے ۔ اسٹیج کے کنارے پر سردی کے موسم میں برسات کی ایک کوئل بولتی جاتی تھی اور مور کی طرح لہراتی اور جھومتی جاتی تھی ۔ الفاظ وھی تھے جو انگریزی لغت کی کتابوں میں چھپتے ھیں اور جو بولنے والوں کی زبانوں سے نکلتے اور کالے سیسے کے حروف بن کر کاغذوں کے چہروں پر نمایاں ھوتے ھیں مگر یہ سانولی سلونی گویا سیسہ کی بنی ھوئی مورت ایسے ٹائپ کا حرف تھا جو حسن ازل کے کارخانے میں ڈھلا ھوگا ۔ یہ ایک ھندوستانی عورت تھی ، ایک بنگالی (نہیں نہیں دکنی حیدر آبادی) عورت تھی ، آواز بھی سریلی ، خیالات بھی نکیلے ، طرز ادا بھی ایسا جیسے معصوم اور

خاموش لکڑی پر لوہے کے تار نغمہ سرائی کرتے ہیں - سروجنی نیڈو نے غالب کے موضوع سے باہر کوئی بات نہیں کی - جو کچھ کہا سونے کی تراز و میں موتیوں سے تول تول کر کہا - مجمع سن رہا تھا اور سن ہوگیا تھا'' -[1]

ہزہائی نس نواب حمید اللہ خاں ، والیٔ بھوپال ، نواب حاجی سر احمد سعید خاں ، سابق گورنر یو - پی - ، نواب صدیق الزماں، فرمانروائے ریاست مانگرول کاٹھیاوار ، سر راجہ اعجاز رسول صاحب قدوائی رئیس جہانگیرآباد (اودھ) ، نواب سر عبدالقیوم خاں ، وزیر صوبہ سرحد ، نواب نصر اللہ خاں صاحب، صدر محاسب سرکار حیدر ، آباد ہزہائی نس سرآغا خاں ، سرصاحب جی مہاراج ، دیال باغ ، شہزادہ والہ شان ہرنس معظم جاہ فرزند اعلیٰ حضور نظام ، جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال اور میاں سر فضل حسین نے ''غالب ڈے'' کی تحریک سے ہمدردی ظاہر فرمائی ، پیغامات بھیجے اور بہت سے اصحاب نے مالی امداد بھی دی -

اقبال نے اس سلسلے میں جو پیغام بھیجا ، اسے کسی طرح رسمی قرار نہیں دیا جا سکتا ، بلکہ وہ الہام کا درجہ رکھتا ہے - انھوں نے اس کے لیے مراقبہ کیا اور جو کچھ انھیں القاء ہوا وہ دو شعروں کی صورت اختیار کر گیا - یہ شعر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں -

اقبال ان دنوں بیمار تھے ، اس لیے خود تو کسی تقریب میں شریک نہ ہو سکے مگر انھوں نے حسب ذیل سطور لکھ کر خواجہ حسن نظامی کو بھیج دیں :

جناب خواجہ صاحب !

دو سال سے علیل ہوں :

سخن اے همنشین از من چه خوامی که با من خویش دارم گفتگوئے

[اے میرے ساتھیو ! مجھ سے پیغام کی کیا توقع رکھتے ہو - میں تو اپنے آپ ہی سے باتیں کرنے میں محو ہوں] پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ مرحوم کی روح سامنے آئی اور دلی والوں کے لیے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہو گئی :

درین محفل که افسون فرنگ از خود بود او را
نگاهے پرده سوز آور ، ولے دانائے راز آور

---

1 - روزنامچہ خواجہ حسن نظامی مطبوعہ ''منادی'' ۲۱-۲۸ فروری ۱۹۳۶ -

مئے این ساقیان لالہ رو ذوقے نمی بخشد
زفیض حضرت غالب ہماں پیمانہ باز آور

[اس محفل میں ، جہاں فرنگیوں کا جادو چل چکا ہے اور ہم اس کا شکار ہیں ، ایک ایسی نگاہ کی ضرورت ہے جو حقیقت پر پڑے ہوئے پردوں کو جلا دے مگر یہ کوئی دانائے راز ہی کر سکتا ہے۔ لالہ رو ساقی جو شراب پلا رہے ہیں ، اس سے ذوق اور کیف پیدا نہیں ہوتا ۔ حضرت غالب کے فیض سے وہی پیالہ بھر لا جس سے کیف و مستی پیدا ہو تا کہ حقیقت ہم پر منکشف ہو جائے ۔]

زیادہ کیا عرض کروں ، سوائے اس کے کہ دعاء کا محتاج ہوں ، ہاں دلی کے پنڈتوں سے سلام کہ دیجیے ۔ ''[1]

لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد[2] مرحوم کی معارف پروری اور ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا گر[3] آنجہانی ، نبیرہ مرزا ہر گوپال تفتہ، کی توجہ اور غیرسرکاری چندوں سے حیدرآباد دکن کے مایۂ ناز ماہر فن تعمیر نواب زین یار جنگ بہادر کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق ۱۵ فروری ۱۹۵۵ کو غالب کے مزار پر سنگ مرمر کی ایک خوبصورت چوکھنڈی لگا دی گئی اور مزار کے سامنے ایک کشادہ صحن بھی تیار کر دیا گیا جس میں جمع ہو کر اب لوگ غالب کو دعائے خیر سے یاد کر سکتے ہیں ۔ غالب کے نام پر ایک یادگار ہال تعمیر کرنے کا منصوبہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے ۔ دیکھیے :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

---

1 - ''منادی'' دہلی ، بابت ۲۱ - ۲۸ فروری ۱۹۳۶ -

2 - وفات ۱۹۵۸ -

3 - افسوس کہ انہیں اپنی مساعی کو پوری طرح بارور دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا ۔